محمد حنیف ندوی

علم الکلام کے چند مشہور اور متداول مدارسِ فکر

علمائے علم کلام سے متعلق یہ مقالہ اپنی جامعیت اور افادیت کے اعتبار سے ایک فکر آفریں چیز ہے۔ اس سلسلے کے بعض مزید پہلو آیندہ اشاعتوں میں پیش کیے جائیں گے

منطق اور اس کے متعلقات پر علامہ ابن تیمیہ نے فکر و تعمق کے جن انمول موتیوں کو چنا ہے اور جس نہج اور انداز سے اپنی خداداد ذہانت و علم کا لوہا منوایا ہے، اس کی جھلکیاں آپ گذشتہ مباحث میں دیکھ چکے ہیں۔ اس وقت ہمیں یہ دکھانا ہے کہ علم الکلام اور فلسفہ نے تاویل و تعبیر کا جو پری خانہ سجایا تھا علامہ نے اسے کس نظر سے دیکھا اور اس کے مقابلہ میں فکر و نظر کی کن استواریوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔

علم الکلام میں آپ کی کیا حیثیت ہے، اور جدل و مناظرہ کے اس فن میں آپ کس رتبہ و مقام پر فائز ہیں۔ اس کو نہایت مختصر لفظوں میں یوں سمجھ لیجیے کہ تاریخی لحاظ سے اشعری و غزالی کے بعد یہ تیسرے اور اپنی جامعیت اور عبقریت کے اعتبار سے پہلے شخص ہیں جنھوں نے مجتہدانہ طریق سے اسلام کے پورے نظام عقائد پر گہرا غور و فکر کیا ہے، اور کتاب و سنت کی ایسی ٹھیٹھ، متوازن اور معقول تشریح کی ہے کہ جس میں عجمی فلسفہ و دانش کی خلل اندازیوں کا شائبہ تک پایا نہیں جاتا۔ بلکہ ہمیں کہنے دیجیے کہ ان کی تحریروں سے کچھ اس طرح کی کیفیات قاری کے قلب و ذہن پر مرتسم ہوتی ہیں

کہ گویا براہِ راست حکمت قرآن سے دو چار ہیں اور بلا واسطہ ریاض نبوت کی شمیم آرائیوں سے سابقہ ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ دعاوی اور دلائل میں ان کی انفرادیت ہر جگہ نمایاں ہے۔

اس سے قبل کہ ہم فلسفہ و کلام کے اہم مباحث چھیڑیں اور فکر و استدلال کی ان اعجوبہ طرازیوں سے تعرض کریں جنھوں نے صدیوں اسلامی ذہن کو برسرِ پیکار رکھا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان متعین مذاہب و فرق کے مختصر حالات بیان کر دیے جائیں کہ جنھوں نے علم الکلام کے شیش محل کی تعمیر کی۔

جبریہ

یہ گروہ اس بات کا قائل تھا کہ انسان اپنے اعمال و افعال کے لحاظ سے کلیتہً مجبور ہے اور اس کی طرف اعمال و افعال کی نسبت اسی طرح مجازی ہے جیسے ہم کہتے ہیں درخت بار آور ہوا، یا ابر برسا، آفتاب طلوع ہوا وغیرہ۔ اس لیے کہ قدرت و اختیار کی تمام تر قدرت اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے۔

انسانی اختیار کے بارہ میں جبر کا یہ تصوّر معلوم ہوتا ہے بنو امیہ کے ابتدائی دور میں پھیل چکا تھا۔ یہی وجہ ہے حضرت ابن عباس اور حسن بصری کو اس کی تردید کرنا پڑی[1]۔ کہا جاتا ہے کہ اول اول اس بدعت کو جعد بن درہم نے رواج دیا۔ اور اس سے متاثر ہو کر جہم بن صفوان نے اسے باقاعدہ ایک نظریہ کی شکل دی اور اسلامی معاشرہ میں پھیلایا[2]۔

اس فرقہ سے متعلق دو باتیں خصوصیت سے قابل لحاظ ہیں۔ ایک یہ کہ جبریہ کے نام سے جو گروہ تاریخ کے صفحات میں مشہور ہوا وہ کوئی متعین مذہب نہیں تھا یا صرف نظریہ جبر ہی پر اس کی اساس نہ تھی۔ بلکہ اس عقیدہ کے قائل دراصل دوسرے گروہوں میں وہ لوگ تھے جو

۱۔ دیکھیے مرتضیٰ کی کتاب 'المنیۃ والامل بحوالہ المذاہب الاسلامیہ' مصنفہ محمد احمد ابو زہرہ، مطبعہ نموذجیہ مصر، ص ۱۴۲

۲۔ یہی ماخذ، ص ۱۴۷

یونانی و عجمی عقلیات سے فی الجملہ متاثر تھے۔ اور اگرچہ اعمال میں جبر کے قائل تھے تاہم اس کے علاوہ صفات کے متعلق بھی اپنے مخصوص متعصبانہ افکار رکھتے تھے۔ چنانچہ جبریہ کا اطلاق ایسا وسیع تھا کہ اس میں نجاریہ اور ضراریہ تک کو داخل سمجھا جاتا تھا۔"[1]

دوسرے یہ کہ جاہلی ذہن اگرچہ ایک طرح کی جبریت کا قائل تھا، مگر ایک متعین گروہ کی حیثیت سے اور ایک نظریہ کے لحاظ سے یہ قطعی نو پیدا اور مستحدث تھا جس کو منجملہ دوسرے فتن کے عجمی اثرات نے پیدا کیا۔ اس کا کھلا ہوا ثبوت یہ واقعہ ہے کہ مفہوم و معنی کے جزوی تحقق کے باوجود لفظ "جبر" کے یہ معنی کہ انسان اعمال و افعال کے لحاظ سے مختار نہیں عربیت فصحیٰ میں کہیں پائے نہیں جاتے یعنی قرآن، حدیث اور قدماء لفظ کے اس اطلاق سے بالکل ناآشنا ہیں۔ اکراہ و اضطرار کے معنوں میں یہ لفظ بقول ابو عبید کے مولّد ہے جس کو بعد کے فلسفیانہ تصورات و افکار کی اشاعت نے شہرت بخشی۔ ورنہ جہاں تک عربیت فصحیٰ کا تعلق ہے اس میں اس کے معنی عموماً اصلاح کرنا، نقصان کی تلافی کرنا، شکستہ ہڈی کو جوڑنا یا کسی نقصان کی قانونی ذمہ داری سے مستثنیٰ ہونا ہے۔ چند استعمالات ملاحظہ ہوں:

جبر العظم المکسور — اس نے ٹوٹی ہوئی ہڈی کو جوڑ دیا

جبر الیتیم — یتیم کی اصلاح کی

جابر۔ ہڈی جوڑنے والے کو کہتے ہیں۔ جبار۔ اللہ کی صفت ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ اس کی ذات عالی قدر ہے اور وہ لوگوں کی ضروریات پوری کرنے والا ہے۔ دیہات میں کہا جاتا ہے البر جبار والمعدن جبار۔ یعنی اگر کوئی شخص کنواں کھود رہا ہے، یا کان میں کام کر رہا ہے اور اس اثناء میں اس کا پاؤں پھسل جاتا ہے، یا کنوئیں کی دیوار گر پڑتی ہے، یا کان پھٹ جاتی ہے اور اس کی وجہ سے اس شخص کی موت واقع ہو جاتی ہے تو اس کی ذمہ داری مالک یا آجر پر عائد نہیں ہوگی۔ اس نکتہ کی وضاحت

۱۔ الملل والنحل، شہرستانی، ص ۶۰

اس لیے ضروری ہے کہ بعض مستشرقین نے ازراہِ تعصب 'جبر' کو قضا و قدر کے مترادف قرار دیا ہے اور اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اسلام کی اصلی اور بنیادی تعلیم جبر ہی کے تصور پر مبنی ہے۔ حالانکہ یہ قطعی صحیح نہیں۔ قضا و قدر کے ہرگز یہ معنی نہیں ہیں کہ عمل اور جدوجہد کی اہمیتوں کی نفی کی جائے بلکہ اس کا سیدھا سادہ مطلب صرف یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ کا علم ہمہ گیر ہے اور وہ اپنے بندوں کی تگ و دو اور اعمال کی تفصیلات سے پوری طرح آگاہ ہے۔ تفصیلی بحث آگے آئے گی۔

قدریہ

یہ گروہ جواب آں غزل کے طور پر، جبریہ کے مقابلہ میں میدان بحث میں اترا۔ اس کا یہ عقیدہ تھا کہ انسان اپنے اعمال و افعال میں مطلقاً مختار اور آزاد ہے۔

قضا و قدر سے متعلق ان کا تصور یہ تھا کہ اس سے مراد اگر زندگی کا کوئی لگا بندھا نظام ہے تو اس کا کوئی وجود نہیں۔ انسان اپنے اعمال و افعال کے اعتبار سے بالکل تازہ کار ہے۔

الامر انف[۱] ہر ہر امر تازہ کاری لیے ہوئے ہے۔

عراق میں معبد الجہنی اور شام میں غیلان اس تصور کے پرجوش حامی تھے۔[۲] ظاہر ہے کہ یہ لوگ صفات میں اس عقلی نقطہ نظر کے حامی تھے کہ جس نے آگے چل کر اعتزال کی شکل اختیار کی۔ قدریہ کو قدریہ کیوں کہتے ہیں۔ اس میں اچھا خاصا اختلاف رونما ہے۔

ایک رائے یہ ہے کہ یہ لوگ چونکہ قضا و قدر کی دخل اندازیوں کے منکر ہیں اس لیے انھیں قدریہ کہتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ نام 'تعرف الاشیاء باضدادھا' (اشیا اپنے ضد سے

۱۔ دیکھیے المذاہب الاسلامیہ ص ۱۸۵

۲۔ معبد الجہنی کے بارہ میں زیادہ تفصیلات معلوم نہیں ہو سکیں۔ سوا اس کے کہ اس نے اول اول عراق میں نظریۂ قدر کی اشاعت و فروغ میں سرگرم حصہ لیا۔ اور ۸۰ھ میں خلیفہ عبد الملک کے حکم سے اسے قتل کر دیا گیا۔

پہچانی جاتی ہیں) کے اصول پر مبنی ہے۔"[1] تسمیہ کی اس شکل میں چونکہ معنی و مفہوم کے اعتبار سے ایک طرح کا تناقض پایا جاتا ہے، اس لیے قدریہ طبعاً اسے پسند نہیں کرتے تھے کہ انھیں اس نام سے پکارا جائے۔ چنانچہ ایک قدری کے اس اعتراض کو جرجانی نے شرح مواقف میں نقل کیا ہے:

ان من یقول بالقدر خیرہ وشرہ من اللہ اولیٰ باسم القدریۃ منا۔"[2]	جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ خیر و شر تمام تر اللہ کے قضا و قدر سے ہے وہ ہم سے زیادہ قدری کہلانے کے مستحق ہیں۔

دوسری رائے یہ ہے کہ یہ لوگ چونکہ انسانی قدرت و اختیار کی وسعتوں کے قائل نہیں۔ اور اس سلسلہ میں قضا و قدر کو حائل نہیں مانتے، اس بنا پر انھیں قدریہ کہا جاتا ہے۔ اسی سبب سے معتزلہ کو بھی قدریہ کہا جاتا ہے۔ کیونکہ یہ لوگ بھی زندگی و عمل کی طرفہ طرازیوں میں انسان کو کلیتہً آزاد و خودمختار قرار دیتے ہیں۔

مستشرقین میں پوکوک (Pocock) دی فلیچر (De Fletcher) اور سیل (Sale) نے اسی رائے کی توثیق کی ہے۔

ہاربروکر (Harbrocker) نے تیسرا موقف اختیار کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ قدریہ نے چونکہ دوسرے مسائل سے قطع نظر قضا و قدر کے موضوع پر خصوصیت سے غور کیا۔ اور اس کے مطالعہ و بحث یا تبلیغ و اشاعت کو اپنی علمی تگ و دو کا ہدف ٹھہرایا۔ اس بنا پر انھیں "قدریہ" کے نام کے ساتھ موسوم کیا گیا۔[3]

اس رائے میں کس درجہ وزن ہے اس کا اظہار اس حقیقت سے ہوتا ہے کہ خوارج اگرچہ اللہ کے سوا کسی شخص کی "حکمیت" کے قائل نہیں تھے تاہم تاریخ میں انھیں "محکمہ" کے لقب سے ملقب

۱۔ گولڈ سیہر اسی رائے کو مرجح سمجھتا ہے۔ دیکھیے التراث الیونانی، عبدالرحمٰن بدوی طبقہ ثانیہ، ص ۲۰۲

۲۔ شرح مواقف، طبعۃ القاہر ۱۳۲۵ھ ج ۸ ص ۳۷۸ بحوالہ التراث ص ۱۹۸

۳۔ التراث ص ۲۰۲

کیا گیا ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ تحکیم کو ماننے والے تھے، یا تحکیم کا انکار کرنے والے تھے بلکہ اس سے مراد صرف یہ تھی کہ یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے مسئلہ تحکیم کو خصوصیت سے بحث ونظر کا موضوع ٹھہرایا۔

معتزلہ

قدریہ نے عقائد وصفات کے باب میں جس عقلیت پسندی کی داغ بیل ڈالی، معتزلہ نے اسے اوج کمال تک پہنچا دیا۔ یہ لوگ بھی اگرچہ بنی امیہ کے دور ہی میں پیدا ہوئے تاہم ان کی فتوحات فکری اور دعوت ومناظرہ کا دائرہ عباسیوں کے معارف پرور عہد تک وسیع ہے۔ اور دراصل اسی زمانہ میں انھیں حقیقی فروغ حاصل ہوا۔ یہاں تک کہ ان کی بدولت علم الکلام کی ان خالص عقلی و ذہنی بحثوں کو جنھیں قوت وتحرکت کی کارفرمائیوں سے ہمیشہ دور رہنا چاہیے مامون، المعتصم اور واثق ایسے سلاطین کی سرکاری سرپرستی حاصل ہوئی۔

(باقی)

"اس میں کوئی شک نہیں کہ جو لوگ اللہ تعالےٰ کی بھیجی ہوئی کتاب (کے مضامین) کا اخفا کرتے ہیں اور اس کے معاوضہ میں (دنیا کا) متاع قلیل وصول کرتے ہیں ایسے لوگ اور کچھ نہیں اپنے شکم میں آگ (کے انگارے) بھر رہے ہیں اور اللہ تعالےٰ ان سے نہ تو قیامت میں (لطف کے ساتھ) کلام کریں گے اور نہ (گناہ معاف کرکے) اُن کی صفائی کریں گے اور ان کو سزائے دردناک ہوگی۔ یہ ایسے لوگ ہیں جنھوں نے (دنیا میں تو) ہدایت چھوڑ کر ضلالت اختیار کی، اور (آخرت میں) مغفرت چھوڑ کر عذاب (سر پر لیا) سو دوزخ کے لیے کیسے باہمت ہیں۔ یہ (ساری مذکورہ سزائیں ان کو) اس وجہ سے ہیں کہ حق تعالےٰ نے (اس) کتاب کو ٹھیک ٹھیک بھیجا تھا اور جو لوگ (ایسی) کتاب میں بے راہی کریں ظاہر ہے وہ بڑی دُور کے خلاف میں ہوں گے۔"

قرآن، سورۃ البقرہ